© rasailojaraid.com



گفتگو کی۔ (مناقب الامام الاعظم، ج ۱ ص ۱۰۵)

مصر کے امام اور فقیہ لیث بن سعد کو بعض حضرات نے امام ابوحنیفہ کے تلامذہ میں شمار کیا ہے۔ (احمد رضا بجنوری، مقدمہ انوار الباری، ج ۱ ص ۲۱۹) اگر باقاعدہ تلمذ نہ بھی ہو، ان کی باہمی ملاقاتیں اور علمی مذاکرے تو بہرحال معروف ہیں۔ ان کی امام صاحب سے سب سے پہلی ملاقات مکہ مکرمہ ہی میں ہوئی اور آپ کی ذہانت اور حاضر جوابی سے متاثر ہوئے۔ (ذہبی، مناقب الامام ابی حنیفة و اصحابه، ص ۱۲۲) اس کے بعد ان کا یہ معمول رہا کہ جب بھی انھیں علم ہوتا کہ امام ابوحنیفہ حج کے لیے آ رہے ہیں تو یہ بھی اس سال سفر حج کرتے تاکہ آپ سے ملاقات اور علمی استفادہ ہو سکے۔ (مقدمہ انوار الباری، ج ۱ ص ۲۱۹)

امام مالک کی زندگی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دوسرے شہروں سے مدینہ منورہ آنے والی علمی شخصیات سے ملاقات اور علمی مذاکرے اور مباحثے کا اہتمام کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں دوسرے شہر کی علمی شخصیت کا عموماً مطلب ہوتا تھا دوسرے فقہی ذوق سے تعلق رکھنے والی شخصیت۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ کے ساتھ آپ کی علمی مجالس کا ذکر تو آ چکا ہے، اسی طرح امام اوزاعی جب مدینہ منورہ آئے تو امام مالک باقاعدہ ان سے ملنے گئے اور ایک طویل علمی مجلس ہوئی جس میں کئی مسائل زیر بحث آئے۔ (ابن ابی حاتم، الجرح والتعدیل، ج ۱ ص ۱۸۸)

اس طبقے کے بعد اگلے طبقے میں بھی یہی روح اور مزاج کارفرما نظر آتا ہے۔ چنانچہ اس طبقے کے مشائخ کے تلامذہ نے اپنے شیوخ سے استفادے یا ان کے انتقال کے بعد دوسرے علمی مراکز اور مناہج فکر سے تعلق رکھنے والی اہم شخصیات سے استفادہ کیا۔ امام ابویوسف اور امام محمد کا امام ابوحنیفہ کے بعد مشائخ حجاز، بالخصوص امام مالک سے استفادہ مشہور ومعروف ہے۔ اسی طرح اسد بن الفرات کا مدینہ منورہ میں امام مالک وغیرہ سے علم حاصل کرنے کے بعد کوفے جانا اور امام محمد وغیرہ سے استفادہ کرنا اور اس کے بعد مصر کا رخ کرنا اہل علم پر مخفی نہیں ہے۔ امام شافعی جو بنیادی طور پر مکہ مکرمہ سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی علمی اٹھان بھی اہل حجاز کے علمی وفقہی ذوق کی بنیاد پر ہوئی تھی، ان کا امام محمد اور دیگر مشائخ عراق سے استفادہ کرنا بھی اس دور کے عمومی ماحول اور مزاج کی عکاسی کرتا ہے۔ امام شافعی سے منقول ہے کہ وہ لیث بن سعد سے استفادہ نہ کر سکنے پر اظہار افسوس کیا کرتے تھے۔ (مقدمہ انوار الباری ج ۱ ص ۲۱۹) (امام شافعی مصر میں لیث بن سعد کی وفات کے بعد آئے تھے)۔

سلف میں کسی کے فقہ وافتاء میں کمال کے لیے ضروری سمجھا جاتا تھا کہ اسے دوسرے فقہی مدارس اور شخصیات کے نقطہ ہائے نظر سے بھی واقفیت ہو، چنانچہ قتادہ کہا کرتے تھے کہ جس شخص کو اختلاف علماء کا علم نہیں، اس نے فقہ کی مہک ہی نہیں سونگھی۔ ہشام بن عبد اللہ رازی کا مقولہ ہے کہ جو شخص اختلاف قراءت سے واقف نہیں، وہ قاری نہیں ہے اور جو شخص اختلاف فقہاء سے واقف نہیں، وہ فقیہ نہیں۔ عطاء کا کہنا ہے کہ جب تک آدمی کو لوگوں (اہل علم) کے اختلاف کا علم نہ ہو، اس وقت تک اس کے لیے فتویٰ دینا جائز نہیں ہے۔ ایوب سختیانی اور سفیان بن عیینہ کا ارشاد ہے کہ فتوے کے معاملے میں زیادہ جسارت کرنے والا شخص وہ ہے جسے اختلاف علماء کا علم کم ہوتا ہے۔ امام مالک فرمایا کرتے تھے کہ



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


فتویٰ دینا صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جسے یہ معلوم ہو کہ کس کس مسئلے میں علماء کا کیا اختلاف ہوا ہے۔ (شاطبی، الموافقات، ج ۴، ص ۸۶)

امام ابوحنیفہ اور امام مالک کے درمیان جو فقہی مباحث ہوئے، ان کے انداز سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مقصد ایک دوسرے کو اپنی رائے کا قائل کرنے کی بجائے دوسرے کی رائے اور دلیل و اصل شرعی معلوم کرنا ہوتا تھا، چنانچہ طحاوی نے اپنی سند کے ساتھ ابن الدراوردی سے دونوں بزرگوں کے درمیان مباحثے کا جو انداز نقل کیا ہے، اس میں یہ بھی ہے:

> ''جب ان میں سے ایک صاحب دوسرے کے اس قول سے پوری طرح واقف ہو جاتے جس کے وہ قائل ہیں اور جس پر ان کا عمل ہے تو دوسرے کو غلط قرار دیے بغیر اور تکلف میں پڑے بغیر اس موضوع بحث کو بند کر دیتے تھے۔'' (موفق، مناقب الامام الاعظم، ج ۲، ص ۱۶۴)

درحقیقت اپنے یا کسی خاص حلقے کی اجتہادی آراء اور نتائج فکر و بحث تک اپنے علم کو محدود رکھنے کی بجائے دوسرے حلقہ ہائے اجتہاد اور نقطہ ہائے نظر سے واقفیت کے کئی فوائد ہوتے ہیں:

سب سے پہلا اور بڑا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسان یا انسانوں کا کوئی خاص گروہ اور طبقہ خواہ کتنی بھی اعلیٰ علمی صلاحیت رکھتا ہو، اس کے کام میں بہتری کی گنجائش بہرحال ہر وقت موجود رہتی ہے۔ بسا اوقات کسی کی نظر وہاں نہیں پہنچتی جہاں دوسرے کی پہنچ جاتی ہے۔ فقہ اسلامی میں ایسی مثالیں بے شمار ہیں کہ جب ایک فقیہ کو دوسرے فقیہ کے کسی ایسے قول اور اس کی دلیل کا علم ہوا جو اس کی نگاہ میں اس کے اپنے قول کے مقابلے میں زیادہ صائب تھا تو اس نے اپنے قول سے رجوع کر لیا۔ امام ابوحنیفہ کے ہاں اگرچہ کھلی مشاورت اور بحث و تدقیق کے بعد مسئلہ طے ہوا کرتا تھا، تب بھی وہ اس میں خطا کا امکان اور مزید بہتری کی ضرورت اور گنجائش محسوس کیا کرتے اور کہا کرتے تھے: ''ہمارا یہ علم رائے (اور اجتہاد) ہے اور یہ سب سے بہتر بات ہے جس تک ہم پہنچ سکے ہیں۔ جو ہمارے پاس اس سے بہتر بات لے کر آئے گا، ہم اسے قبول کر لیں گے۔'' (ذہبی، مناقب الامام ابی حنیفۃ و اصحابہ، ص ۲۱)

دوسرا فائدہ اس میں یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات خاص موقع و محل کی رعایت سے کسی دوسرے فقیہ کے قول پر عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ واقفیت ایسے مواقع پر کام آتی ہے۔ فقہاء کے ہاں اس کی کئی مثالیں ملتی ہے۔ مثلاً ایک مقدمے میں جب امیر المومنین کی طرف سے گواہ پیش ہوئے تو امام ابو یوسف نے کہا کہ امیر المومنین سے اس بات پر قسم بھی لی جائے گی کہ ان کے گواہوں نے سچی گواہی دی ہے، حالانکہ امام ابو یوسف کا اپنا یہ مذہب نہیں تھا۔ یہ ابن ابی لیلیٰ کی رائے تھی، لیکن یہاں چونکہ قرائن سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ شاید گواہوں نے خلیفہ کی رعایت کر کے غلط بیانی سے کام لیا ہو، اس لیے امام ابو یوسف نے یہاں ابن ابی لیلیٰ کے قول کو اختیار کر لیا۔ (خطیب بغدادی، تاریخ بغداد، ج ۱۴، ص ۲۴۹)

تیسرا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ باہمی ربط نہ ہونے اور ایک دوسرے کے نقطہ نظر اور اس کے دلائل سے عدم واقفیت کی وجہ سے جو غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں اور اس کے نتیجے میں توانائیوں کا ایک حصہ جو ایک دوسرے کی بے جا مخالفت وغیرہ کی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


شکل میں بے ثمر سرگرمیوں کی نذر ہو جاتا ہے، اس سے انسان بچ جاتا ہے۔

دوسری صدی ہجری میں اور تیسری صدی کے اوائل میں مختلف فقہی مکاتب فکر کے درمیان ربط اور باہمی استفادے کا جو سلسلہ تھا، اس کی کچھ جھلک اوپر کی سطور میں دیکھی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود جہاں جہاں ایک دوسرے کو پورے طور پر سمجھا نہیں گیا، وہاں غلط فہمیاں بلکہ محاذ آرائیاں پیدا ہوتی رہی ہیں۔ چنانچہ امام احمد، امام شافعی کے اہل علم پر احسانات شمار کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''ہم اہل رائے کو برا بھلا کہتے رہے اور وہ ہمیں، یہاں تک کہ شافعی آئے اور انھوں نے ہم دونوں کو جمع کر دیا۔'' (ظفر احمد عثمانی، مقدمہ اعلاء السنن، ج ۱، ص ۲۳۵)

آج بھی فقہ اسلامی کو دوسری صدی ہجری سے ملتے جلتے چیلنجوں کا سامنا ہے اور الحمد للہ عالم اسلام میں کئی فقہاء ان سے عہدہ برآ ہونے کے لیے مصروف کار ہیں۔ ان کے اذواق اور مناہج اجتہاد میں فرق بھی ہے۔ اجتماعی اجتہاد کی طرف بڑھنے کے لیے پچھلے صفحات میں اس ضرورت کا ذکر کیا گیا ہے کہ پہلے قدم کے طور پر اس اختلاف منہج و ذوق کے وجود کو تسلیم کیا جائے اور اسے باعث رحمت بھی سمجھا جائے۔ دوسرا قدم اس منزل کی طرف یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ ہر منہج فکر اور حلقہ فقہ **کل فی فلک یسبحون** کا مصداق بن کر اپنے اپنے خول میں بند رہے، ان کے درمیان ربط و تعلق ہو۔ ایک دوسرے کے فکری و فقہی کام سے واقف ہوں اور اس سے استفادہ کریں۔ جس طرح اس دور کے فقہاء نے فقہ و افتاء میں کمال اور اجتہاد کے لیے دیگر مدارس فقہ کے اقوال سے واقفیت کو ضروری قرار دیا تھا، اسی طرح آج کے علماء و فقہاء کے لیے بھی دیگر مکاتب فکر کی آراء سے واقفیت ضروری ہے۔ عالم اسلام میں ہونے والے فقہی واجتہادی کاموں اور ان کے نتائج فکر سے آگاہی کے بغیر نہ تو کسی کے فقہی و اجتہادی کام میں کمال اور جان پیدا ہو سکتی ہے اور نہ اجتماعی فقہی کاوشوں کی راہ ہی ہموار ہو سکتی ہے۔ آج ذرائع مواصلات کی ترقی نے ایک دوسرے سے استفادے کے اس کام کو آسان بنا دیا ہے۔

## مثبت اور ثمر آور مکالمے کا اہتمام

دوسری صدی ہجری میں فقہ اسلامی کے ارتقائی سفر کو تیز کرنے والی دوسری اہم چیز فقہی و اجتہادی مسائل میں ایک ہی فقہی ذوق رکھنے والے اور مختلف فقہی سلسلوں سے منسلک فقہاء کے درمیان بامقصد اور صواب طلبی کی نیت پر مبنی مباحثے اور مکالمے کا سلسلہ تھا۔ یہ سلسلہ عصر صحابہ ہی میں شروع ہو گیا تھا، بلکہ اس کی اساس عہد نبوی میں ہی ڈال گئی تھی۔ معروف شارح موطا زرقانی لکھتے ہیں:

> ''مناظرہ اور دلیل و حجت طلب کرنا صحابہ کے قدیم زمانے سے ہی چلا آ رہا ہے۔ اس کا انکار صرف جاہل ہی کر سکتا ہے اور یہ کہ بڑے کو چاہیے کہ اگر چھوٹے کے پاس علم ہو تو اسے بولنے سے منع نہ کرے، کیونکہ بعض اوقات انسان عمر میں چھوٹا ہوتا ہے، لیکن علم میں بڑا ہوتا ہے۔'' (زرقانی، شرح الموطا، ج ۳، ص ۲۲۲)

حضرت عمر بن عبد العزیز کا ارشاد ہے: **رایت ملاحاۃ الرجال تلقیحا لالبابھم** (میری رائے ہے کہ آدمیوں



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



کا باہمی مباحثہ ان کی عقلوں کی بارآوری کا ذریعہ ہوتا ہے)۔(ابن عبدالبر، جامع بیان العلم وفضلہ، ج۲،ص ۱۰۸) اسی طرح امام مالک نے عمر بن عبدالعزیز کا قول نقل کیا ہے کہ: **ما رایت احدا لاحی الرجال الا اخذ بجوامع الکلم** (میں نے دیکھا ہے کہ جو شخص بھی مباحثہ کرتا ہے، وہ ضرور جامع باتیں حاصل کر لیتا ہے)۔(ایضاً)

اس دور کے بعد بھی فقہی حلقوں میں مباحثے اور مکالمے کا یہ اہتمام جاری رہا، بالخصوص عراق کے فقہی حلقے تو اس حوالے سے خاصے معروف تھے، حتیٰ کہ اہل عراق کو اس دور کے علمی حلقوں میں ارایتیــن کے لقب سے یاد کیا جاتا تھا۔ فقہائے عراق میں سے امام ابوحنیفہ کو مباحثے کی اہمیت وافادیت کا خاص ادراک تھا، اس لیے آپ نے اسے ایک طرف پیش آمدہ مسائل کے مشاورتی واجتماعی حل کا ذریعہ بنایا اور دوسری طرف نوخیز فقہاء کو اجتہاد کی تربیت دینے اور ان کی علمی وفکری صلاحیتوں کو جلا دینے کا۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے آپ نے باقاعدہ ایک مجلس قائم کر رکھی تھی جس میں اس طرح کے مسائل زیر بحث آتے تھے اور مسئلے کے ہر پہلو پر پوری بحث وتمحیص کے بعد کوئی فیصلہ کیا جاتا تھا......

اس حلقے کی سب سے اہم بات جسے یہاں ذکر کرنا مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ اس میں مسئلے پر آزادانہ بحث کو خاص اہمیت دی جاتی تھی۔ ایک مرتبہ سفیان بن عیینہ نے دیکھا کہ امام صاحب کے اردگرد آپ کے تلامذہ کسی مسئلے پر بحث کر رہے ہیں اور ان کی آوازیں بلند ہو رہی ہیں۔ سفیان بن عیینہ نے امام صاحب سے کہا کہ آپ انھیں مسجد میں آواز بلند کرنے سے منع کیوں نہیں کرتے؟ امام صاحب نے کہا ''انھیں کچھ نہ کہیے۔ کیونکہ اس کے بغیر یہ لوگ فقہ میں کمال حاصل نہیں کر سکتے۔'' (ذہبی، مناقب الامام ابی حنیفۃ واصحابہ، ص۲۱) یہی نکتہ ہے جس کے پیش نظر امام بخاری نے اپنی صحیح کی کتاب العلم میں مستقل باب قائم کیا ہے: **باب رفع الصوت بالعلم**۔

ایک دفعہ ایک نوجوان نے امام ابوحنیفہ سے دوران مجلس کوئی بات پوچھی۔ امام صاحب نے اس کا جواب دیا۔ اس نوجوان نے فوراً کہا: **اخطات** (آپ کی یہ بات درست نہیں ہے)۔ اس پر نووارد شخص کو بڑی حیرت ہوئی اور وہ اس نوجوان کو استاذ کے احترام کے بارے میں کچھ کہنے لگا تو امام صاحب نے اسے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''اسے چھوڑ دیجیے۔ میں نے اپنے بارے میں قصداً انھیں اس کا عادی بنایا ہے۔'' (مناظر احسن گیلانی، امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی، ص ۲۲۸) یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ امام صاحب جہاں آزادی کے ساتھ بحث کو ضروری خیال کرتے تھے، وہاں بحث میں نظم وضبط کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ آپ کو ایک مرتبہ بتایا گیا کہ یہاں ایک حلقہ ہے جس میں لوگ فقہ کے بارے میں غور وفکر کرتے ہیں تو امام صاحب نے پوچھا: ''کیا ان کا کوئی سربراہ بھی ہے؟'' جب جواب نفی میں دیا گیا تو آپ نے فرمایا ''یہ لوگ کبھی فقیہ نہیں بن سکتے۔'' (موفق، مناقب الامام الاعظم، ج۲، ص۹۱)

امام ابوحنیفہ اسے تعلیم وتربیت کا ایک لازمی اور ضروری حصہ سمجھتے تھے اور یہ خیال کرتے تھے کہ اس طرح کے سوال وجواب اور اجتماعی مباحثے (group discussion) کے بغیر اہل علم میں اجتہاد وتفقہ کا ملکہ اور خود سوچنے اور غور کرنے کی عادت کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ امام صاحب نے جس طرح اپنے پیش رو تابعین کے بارے میں کہا تھا: **ھم رجال ونحن رجال**، اسی طرح وہ یہ روح اپنے تلامذہ کے اندر پیدا کرنا چاہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مسائل میں جتنا



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اختلاف امام صاحب کے تلامذہ نے ان سے کیا ہے، کسی اور کے تلامذہ نے نہیں کیا ہوگا اور جو مقام بعد میں امام صاحب کے تلامذہ کو حاصل ہوا ہے، وہ بھی کسی اور کو حاصل نہیں ہوا ہوگا۔ امام صاحب کے اسی طریق کار کا یہ اثر تھا کہ امام شافعی نے کہا کہ جس شخص سے بھی میں نے بحث کی، بحث کے دوران میں اس کے چہرے پر ناگواری کا اثر ضرور آیا، سوائے محمد بن الحسن کے۔ (ذہبی، **مناقب الامام ابی حنیفۃ**، ص ۴۸)

بحث ومناظرہ کا یہ سلسلہ اگلے طبقات میں بھی چلتا رہا ہے۔ امام مالک کے تلامذہ میں سے امام شافعی کی شخصیت اس حوالے سے خاصی معروف ہے۔ بقول زاہد الکوثری انھوں نے امام محمد بن الحسن سے اس کی باقاعدہ تربیت حاصل کی تھی۔ (بلوغ الامانی فی سیرۃ الامام محمد بن الحسن الشیبانی، ص ۲۲)

اس دور میں مباحثوں کی کثرت کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ امام احمد بن حنبل جو بظاہر محدثین کے مزاج کے زیادہ قریب ہیں اور فضول بحث ومباحثے سے ظاہر ہے کہ بہت گریزاں ہوں گے، ان کے بارے میں ابو العباس الساجی کہتے ہیں کہ میں نے بے شمار مرتبہ اپنے اور امام احمد کے درمیان ہونے والے مناظروں کے دوران میں ان سے سنا کہ ابو عبد اللہ الشافعی نے یوں کہا ہے۔ (ابو نعیم اصفہانی، حلیۃ الاولیاء، ج ۹، ص ۱۰۰)

حاصل کلام یہ ہے کہ اس دور کے علمی وفقہی ماحول کا اہم عنصر ایک ہی مکتب فکر یا مختلف مکاتب فکر سے تعلق رکھنے والوں کے درمیان بامقصد مباحثہ اور مکالمہ تھا۔ حضرت عمر بن عبد العزیز کے قول کے مطابق اس چیز نے ذہنوں کو زیادہ بارآور کر دیا تھا۔ آج بھی اگر فقہ اسلامی کی فعالیت اور حرکیت میں اضافہ کرنا ہے اور اس میں ہر دور کے چیلنجوں کا سامنا کرنے کی جو صلاحیت موجود ہے، اسے زیادہ سے زیادہ بروئے کار لانا ہے تو باہمی مکالمے اور مباحثے کی اس روح کو زیادہ سے زیادہ فعال کرنا ہوگا، بلکہ اجتماعی فقہی غور وفکر کی روح ہی اس طرح کا مکالمہ ومباحثہ ہے۔ آج ترقی یافتہ میڈیا کے دور میں یہ کام پہلے کے مقابلے میں زیادہ آسانی کے ساتھ کیا جا سکتا ہے۔

---



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


# علمی وفکری مباحثہ کی ضرورت اور 'الشریعہ' کی پالیسی

## [مولانا زاہد الراشدی کی منتخب تحریریں]

[الشریعہ کی سترہویں جلد (۲۰۰۶ء) کے آغاز کے موقع پر ''کلمہ حق'' سے اقتباس]

بحمد اللہ تعالیٰ زیر نظر شمارے کے ساتھ ہم 'الشریعہ' کی سترہویں جلد کا آغاز کر رہے ہیں۔ آج سے کم وبیش سولہ سال قبل اکتوبر ۱۹۸۹ء میں 'الشریعہ' نے ماہوار جریدے کے طور پر اپنا سفر شروع کیا تھا اور اتار چڑھاؤ کے مختلف مراحل سے گزرتے ہوئے یہ دینی وفکری ماہنامہ اپنی موجودہ شکل میں قارئین کے سامنے ہے۔

الشریعہ اکادمی گوجرانوالہ کے اس ترجمان کی ابتدا اس عزم کے ساتھ ہوئی تھی کہ دور حاضر کے مسائل اور چیلنجز کو سامنے رکھتے ہوئے اسلامی تعلیمات واحکام کو جدید اسلوب اور تقاضوں کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی، عالم اسلام کے علمی ودینی حلقوں کے درمیان رابطہ ومفاہمت کے فروغ کی راہ ہموار کی جائے گی، اسلام دشمن لابیوں اور حلقوں کے تعاقب اور نشان دہی کا فریضہ انجام دیا جائے گا اور دینی حلقوں میں فکری بیداری کے ذریعے سے جدید دور کے علمی وفکری چیلنجز کا ادراک واحساس اجاگر کیا جائے گا۔ ان مقاصد کی طرف ہم کس حد تک پیش رفت کر پائے ہیں، اس کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا، البتہ ہمارے لیے یہ بات بہرحال اطمینان بخش ہے کہ یہ اہداف ومقاصد بدستور ہماری نگاہوں کے سامنے ہیں اور ہم اپنی بساط اور استطاعت کی حد تک ان کے لیے مسلسل مصروف عمل ہیں۔

اس دوران میں ہماری بھرپور کوشش رہی ہے کہ پیش آمدہ مسائل پر دینی حلقوں میں بحث ومباحثہ کا ماحول پیدا ہو اور کسی بھی مسئلہ پر اپنا موقف پیش کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے فریق کا موقف اور دلائل بھی حوصلہ اور اطمینان کے ساتھ سننے اور پڑھنے کا مزاج بنے، کیونکہ اس کے بغیر کسی مسئلہ پر صحیح رائے اور نتیجہ تک پہنچنا ممکن نہیں ہوتا۔ مگر بدقسمتی سے ہمارے ہاں تحقیق، مطالعہ، مباحثہ اور مکالمہ کی روایت ابھی تک جڑ نہیں پکڑ سکی اور چند شخصیات کے استثنا کے ساتھ عمومی ماحول یہی ہے کہ دلائل کی روشنی میں رائے قائم کرنے کے بجائے رائے قائم کر کے اس کے لیے دلائل تلاش کیے جاتے ہیں۔ ہماری کوشش رہی ہے اور آئندہ بھی ان شاء اللہ تعالیٰ رہے گی کہ دینی حلقوں، بالخصوص علماء کرام اور طلبہ کو دنیا کے معروضی حالات اور حقائق سے آگاہی حاصل کرنے اور آج کے معاصر علمی وفکری حلقوں کے موقف، دلائل اور طرز استدلال سے شناسا ہونے کے لیے آمادہ کیا جائے اور انھیں اس ضرورت کا احساس دلایا جائے کہ آج کی دنیا سے


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



بات کرنے کے لیے آج کی زبان اور اسلوب پر دسترس ناگزیر ہے اور ہم ماضی کے اسلوب اور طرز استدلال کے ذریعے سے آج کی دنیا تک اسلام کا پیغام اور تعلیمات پہنچانے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

یہ بات بھی ہمارے ایجنڈے کا حصہ چلی آ رہی ہے کہ جدید اسلوب اور طرز استدلال کی طرح ابلاغ کے جدید ذرائع اور تکنیک تک دینی حلقوں اور علماء کرام کی رسائی بھی انتہائی ضروری ہے اور ہم اس ضرورت کی طرف دینی حلقوں کو مسلسل توجہ دلا رہے ہیں۔

ہم وہی بات کہہ رہے ہیں جو تین صدیاں قبل حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے فرمائی تھی کہ آنے والے دور میں دین کو صحیح طور پر پیش کرنے کے لیے عقلی استدلال کے ہتھیار سے کام لینا ہوگا اور فکری جمود کے دائرے سے نکل کر کھلے دل ودماغ کے ساتھ مسائل کا تجزیہ کرنا ہوگا۔ حضرت شاہ صاحب نے یہ بات تین سو سال قبل کے ماحول میں فرمائی تھی اور ہم اسی بات کو تین سو سال کے بعد آج کے حالات اور تناظر میں دینی حلقوں اور ارباب علم ودانش کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔ ممکن ہے بعض دوستوں کو ہمارا کہنے کا انداز حضرت شاہ صاحب سے مختلف دکھائی دے، مگر مقصد اور ہدف کے اعتبار سے ہم وہی کچھ عرض کر رہے ہیں جو تین صدیاں قبل امام ولی اللہ دہلویؒ پورے شرح وبسط کے ساتھ تحریر فرما چکے ہیں۔

ہمارا طریق کار یہ رہا ہے کہ بعض مسائل کو ہم از خود چھیڑتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ ہمارا موقف بھی وہی ہو جو کسی مسئلہ پر بحث کا آغاز کرتے ہوئے 'الشریعہ' کے صفحات میں پیش کیا گیا ہے، مگر ہماری خواہش ہوتی ہے کہ دینی حلقوں کے ارباب فکر ودانش اس طرف توجہ دیں، مباحثہ میں شریک ہوں، اپنا نقطہ نظر دلائل کے ساتھ پیش کریں، جس موقف سے وہ اختلاف کر رہے ہیں، اس کی کمزوری کو علمی انداز سے واضح کریں اور قوت استدلال کے ساتھ اپنے موقف کی برتری کو واضح کریں، کیونکہ اب وہ دور نہیں رہا کہ کسی مسئلہ پر آپ اپنی رائے پیش کر کے اس کے حق میں چند دلائل کا تذکرہ کرنے کے بعد مطمئن ہو جائیں کہ رائے عامہ کے سامنے آپ کا موقف واضح ہو گیا ہے اور آپ کی بات کو قبول کر لیا جائے گا۔ آج کا دور تقابلی مطالعہ کا دور ہے، تجزیہ واستدلال کا دور ہے اور معروضی حقائق کی تفصیلات وجزئیات تک رسائی کا دور ہے۔ آپ کو یہ سارے پہلو سامنے رکھ کر اپنی بات کہنا ہوگی اور اگر آپ کی بات ان میں سے کسی بھی حوالے سے کمزور ہوگی تو وہ پذیرائی حاصل نہیں کر سکے گی۔ ہم جب کسی مسئلے پر بحث چھیڑتے ہیں تو امکانی حد تک اس کے بارے میں تمام ضروری پہلوؤں کو اجاگر کرنا ہمارا مقصد ہوتا ہے اور ہماری کوشش ہوتی ہے کہ 'الشریعہ' میں شائع ہونے والے کسی موقف کے حق میں یا اس کے خلاف موصول ہونے والا کوئی مضمون یا مراسلہ اشاعت سے رہ نہ جائے اور اس بحث کا کوئی پہلو تشنہ نہ رہے۔

اس صورت حال سے بعض دوستوں کو الجھن ہوتی ہے اور وہ اس کا اظہار بھی کرتے ہیں، مگر ہمارے خیال میں یہ الجھن عام طور پر دو وجہ سے ہوتی ہے۔ ایک اس وجہ سے کہ بہت سے دوست ہمارے اس طریق کار اور مقصد کو سمجھ نہیں پاتے جس کا سطور بالا میں تذکرہ ہو چکا ہے اور دوسرا اس وجہ سے کہ ہمارے خاندانی پس منظر کے باعث بہت سے دوست 'الشریعہ' کو ایک مسلکی جریدہ کے طور پر دیکھنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے مسلک ومشرب کا



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


تعلق ہے، ہم نے سولہ برس قبل 'الشریعہ' کے پہلے شمارے میں ہی یہ بات دوٹوک طور پر واضح کر دی تھی کہ ہم اہل السنۃ والجماعۃ میں سے ہیں اور اہل سنت کے مسلمات کی پابندی کو اپنے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ہم فقہی مذہب کے لحاظ سے حنفی ہیں اور فروع و احکام میں حنفی مذہب کے اصول اور تعبیرات کو ترجیح دیتے ہیں، جبکہ مسلک و مشرب کے حوالے سے دیوبندی ہیں اور اکابر علماء دیوبند کثر اللہ جماعتہم کی جدوجہد اور افکار سے راہ نمائی حاصل کرنا اپنے لیے باعث سعادت تصور کرتے ہیں، لیکن 'الشریعہ' کو مسلکی ترجمان کے طور پر ہم نے کبھی پیش نہیں کیا۔ مسلک کی ترجمانی کے لیے ملک میں درجنوں جرائد موجود ہیں اور ہم بھی اس مقصد کے لیے ان سے حتی الوسع تعاون کرتے ہیں، مگر ہمارا عملی میدان اس سے بالکل مختلف ہے۔ ہماری تگ و تاز کا دائرہ فقہی اور مسلکی کشمکش نہیں، بلکہ مغرب کے فکر و فلسفہ اور تہذیب و ثقافت کی وسیع تر یلغار کے تناظر میں اسلامی تعلیمات و احکام کو جدید زبان اور اسلوب میں پیش کرنا ہے۔ اس کا مطلب فقہی اور مسلکی جدوجہد کی ضرورت سے انکار نہیں بلکہ یہ ایک تقسیم کار ہے کہ دینی جدوجہد کا یہ شعبہ ہم نے اپنی جدوجہد کے لیے مختص کر لیا ہے اور اسی میں اپنی صلاحیتیں صرف کرنا چاہتے ہیں۔

بعض دوستوں نے یہ شکوہ کیا ہے کہ 'الشریعہ' میں بسا اوقات ایک ہی مسئلہ پر متضاد مضامین شائع ہوتے ہیں اور بعض مضامین اہل سنت، حنفیت اور دیوبندیت کے حوالوں سے روایتی موقف سے متصادم ہوتے ہیں۔ ہمیں اس سے انکار نہیں ہے، مگر اس کی وجہ وہی ہے جس کا سطور بالا میں ہم تذکرہ کر چکے ہیں کہ ہم علمی و فکری مسائل میں ارباب علم و دانش کو بحث و مباحثہ کے لیے کھلا ماحول اور فورم مہیا کرنا چاہتے ہیں اور دینی حلقوں میں باہمی مکالمہ کا ذوق بیدار کرنا چاہتے ہیں۔ یہ طریق کار ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ بھی جاری رہے گا، تاہم اب اسے قدرے محدود اور معین و متشخص کیا جا رہا ہے، اس طور پر کہ 'الشریعہ' کے ہر شمارے کے ایک تہائی صفحات اس طرح کے کھلے مباحثہ کے لیے مخصوص کیے جا رہے ہیں جن میں کسی بھی اہم مسئلہ پر مختلف نقطہ ہائے نظر پیش کیے جائیں گے اور کسی بھی نقطہ نظر کی حمایت یا مخالفت میں موصول ہونے والا ہر وہ مضمون شامل اشاعت ہوگا جو طعن و تشنیع اور مناظرانہ موشگافیوں سے گریز کرتے ہوئے افہام و تفہیم کے سنجیدہ اور علمی اسلوب میں تحریر کیا گیا ہو۔ [الشریعہ، جنوری ۲۰۰۶ء]

## علمی مسائل میں آزادانہ بحث و مباحثہ کی ضرورت

جہاں تک علمی مسائل میں آزادانہ بحث و مباحثہ کا تعلق ہے، یہ بات درست ہے کہ ''الشریعہ'' نے گزشتہ بیس سال کے دوران اس کا ماحول پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کی ہے اور اب بھی یہ ہمارے اہداف میں شامل ہے، اس لیے کہ آج کے حالات میں آزادانہ بحث و مباحثہ کے بغیر کسی بھی مسئلے میں منطقی نتیجے تک پہنچنا ممکن نہیں ہے اور عالمی ذرائع ابلاغ اور تعلیمی مراکز نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مختلف اطراف سے شکوک و شبہات پیدا کرنے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے، اس کے اثرات سے نئی نسل کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمارا روایتی اسلوب کافی نہیں ہے۔ ماضی نے اپنا علمی خزانہ کتابوں اور سی ڈیز کی شکل میں اگل دیا ہے اور آج کوئی بھی ذی استعداد اور باصلاحیت نوجوان اپنے چودہ سوسالہ علمی


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


ماضی کے کسی بھی حصہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے یا کسی بھی طبقے کا موقف اور دلائل معلوم کرنا چاہے تو اسے اس کے بھرپور مواقع اور وسائل ہر وقت میسر ہیں۔ اس ماحول میں یہ کوشش کرنا کہ نوجوان اہل علم صرف ہمارے مہیا کردہ علم اور معلومات پر قناعت کریں اور علم اور معلومات کے دیگر ذرائع سے آنکھیں اور کان بند کر لیں، نہ صرف یہ کہ ممکن نہیں ہے بلکہ فطرت کے بھی منافی ہے۔ اس لیے آج کے دور میں ہماری ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے اور یہ بات ہمارے فرائض میں شامل ہو جاتی ہے کہ مطالعہ اور تحقیق کے اس سمندر سے نئی نسل کو روکنے کی بجائے خود بھی اس میں گھسیں اور ان متنوع اور مختلف الجہات ذرائع معلومات میں حق کی تلاش یا حق کے دائرے کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی راہنمائی کریں۔ چنانچہ علم وفکر کی دنیا میں میرا ذوق روکنے یا باز رکھنے کا نہیں بلکہ سمجھانے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہر ممکن مدد کرنے کا ہے۔ کسی دوست کو یہ طریقہ پسند ہو یا نہ ہو، لیکن میں اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اس کے لیے بحث ومباحثہ ضروری ہے، مسائل کا تجزیہ وتنقیح اور دلائل کی روشنی میں ان کا حل خالص علمی انداز میں تلاش کرنا ضروری ہے، البتہ اس بحث ومباحثہ میں علمی اصول اور مسلمات کا لحاظ اور گفتگو کو ان کے دائرے میں محدود رکھنا بھی اس کا ناگزیر تقاضا ہے۔ ......

اس سلسلے میں حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے فقہی ذوق کا حوالہ دینا بھی ضروری سمجھتا ہوں جو ''فتاویٰ مفتی محمود'' کے دیباچہ میں مولانا مفتی محمد جمیل خان شہیدؒ نے حضرت مولانا محمد عبید اللہ دامت برکاتہم (مہتمم جامعہ اشرفیہ لاہور) کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ حضرت مولانا عبید اللہ مدظلہ حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے ساتھ ایک ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> ''مفتی صاحبؒ نے اس ملاقات میں مجھ سے ایسی بہت سی باتیں کہیں جن سے میرے دل کو تسلی ہوئی۔ مجھے اس بالمشافہہ گفتگو سے اندازہ ہو گیا کہ مفتی صاحب اپنے دل میں ''اتحاد بین المسلمین'' کے لیے بڑی تڑپ رکھتے ہیں اور فرقہ واریت سے انھیں طبعی نفرت ہے۔ چونکہ اس وقت وہ نوجوان تھے، اس لیے ایک نوجوان عالم کی زبانی اتنی سنجیدہ اور فکر انگیز گفتگو میرے لیے خوشی کا باعث بنی۔ نوجوان عموماً جذباتی ہوتے ہیں، ان کی سوچ بھی جذباتی ہوتی ہے، ان کے فیصلے بھی جذباتی ہوتے ہیں۔ مجھے اطمینان ہوا کہ ہمارے ہم عصر علما میں وہ ایک پختہ فکر، صائب الرائے اور زیرک انسان ہیں۔ ان کی یہی صفت میرے دل کو بھائی۔ اس کے بعد ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ ان ملاقاتوں میں علمی، سیاسی اور ملی مسائل کے علاوہ بین الاقوامی مسائل بھی زیر بحث آئے اور ان کی فقہی رائے کو میں نے ہمیشہ قوی پایا۔
>
> بعض مسائل میں وہ اپنی انفرادی رائے بھی رکھتے تھے۔ مثال کے طور پر فقہی مسائل پر عمل کے سلسلہ میں ان کی رائے یہ تھی کہ مخصوص حالات میں ایک حنفی کے لیے جائز ہے کہ وہ کسی خاص مسئلے میں ائمہ اربعہ میں سے کسی کی پیروی کرے۔ ایسا آدمی ان کے نزدیک حنفیت سے خارج نہیں ہوتا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ امام محمدؒ اور امام ابو یوسفؒ نے متعدد مسائل میں امام صاحبؒ سے اختلاف کیا ہے۔ ان کی اپنی ترجیحات ہیں، لیکن ان پر


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



حنفیت سے خروج کا الزام نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ اپنے اختلافات اور ترجیحات کے باوجود حنفی تھے۔ اسی طرح اگر کسی مسئلہ میں امام صاحبؒ کا قول موجود نہ ہو یا موجود ہو تو مگر سمجھ نہ آئے یا سمجھ بھی آئے لیکن حالات کی خاص نوعیت کے تحت اس پر عمل ممکن نہ ہو تو کسی دوسرے امام کی پیروی درست ہوگی۔ اس سلسلے میں ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر ایسی شکل وصورت پیش آ جائے تو صاحبینؒ کے قول پر عمل کیا جائے۔ اگر صاحبینؒ کے قول میں بھی یہی صورت پیش آئے تو امام محمدؒ کے قول کو ترجیح دی جائے۔ اس کے بعد ائمہ اربعہ میں سے کسی ایک کے اقرب قول پر عمل کر لیا جائے۔ ان کے نزدیک کسی خاص مسئلہ میں خروج عن الحنفیت تو جائز ہے لیکن مذاہب اربعہ سے خروج جائز نہیں ہے۔ اس نقطہ نظر میں مولانا مفتی محمودؒ منفرد تھے۔ تاہم وہ اس بات کے بھی قائل تھے کہ ایسا کرنا ان علما کا کام ہے جن کی مذاہب اربعہ پر وسیع نظر ہے، جو کسی مسئلہ کے ترجیحی پہلوؤں کو اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ عام آدمی کے لیے یہ درست نہیں ہے کہ وہ سنی سنائی باتوں پر عمل کرے، کیونکہ ایسی اجازت دینے سے اس کے عقیدے میں خلل آ سکتا ہے اور لوگ اپنی مرضی سے ادھر ادھر بھٹکنے کے عادی بن سکتے ہیں، جب کہ ایسی صورت صرف اس وقت پیش آ سکتی ہے جب ملکی قوانین کی تدوین کی صورت میں علما کسی مشکل سے دوچار ہو جائیں تو وہ اس رعایت سے فائدہ اٹھا سکیں، کیوں کہ اصل چیز امام کا قول نہیں، اصل چیز وہ نص ہے جس کی روشنی میں یہ قول متشکل ہوا ہے، یعنی منصوص چیزیں جو ائمہ اربعہ کی علمی تحقیقات کے نتیجے میں معلوم ہوئیں۔ ائمہ اربعہ نے بے پناہ تحقیق وجستجو کے بعد قرآن وحدیث سے مسائل مستنبط کیے ہیں، اس لیے یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ کسی مسئلہ پر اگر احناف کے ہاں کوئی دلیل یا سند نہیں ہے تو دوسرے مذاہب سے اسے لینا درست ہوگا، بشرطیکہ وہ وہاں بہتر صورت میں موجود ہو''

حضرت مولانا مفتی محمودؒ کے فقہی ذوق اور علمی اسلوب کے بارے میں حضرت مولانا عبید اللہ دامت برکاتہم کا یہ ارشاد گرامی تفصیل کے ساتھ میں نے اس لیے نقل کیا ہے کہ میرا طالب علمانہ ذوق بھی بعینہ اسی طرح کا ہے، البتہ حضرت مولانا عبید اللہ مدظلہ نے اسے حضرت مولانا مفتی محمودؒ کا انفرادی ذوق بتایا ہے، جب کہ میرے خیال میں اور بزرگ بھی اس ذوق میں ان کے ساتھ شریک ہیں، جیسا کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی اپنی کتاب ''اسلامی بینکاری۔ تاریخ وپس منظر اور غلط فہمیوں کا ازالہ'' میں لکھتے ہیں کہ:

''حضرت تھانوی رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت گنگوہیؒ سے معاملات کے اندر اس بات کی صریح اجازت لی ہے کہ معاملات میں لوگوں کی آسانی کے لیے ائمہ اربعہ میں جہاں بھی توسع ہو، اسے لے لیا جائے۔ ''حضرت گنگوہی سے صریح اجازت لی'' میں نے یہ الفاظ حضرت والد صاحب (مفتی اعظم حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ) سے بعینہ سنے ہیں اور ایک جگہ حضرت والد صاحبؒ نے لکھے بھی ہیں۔''......

o میری طالب علمانہ رائے میں حاجات عامہ، ملکی قوانین کی تدوین اور اجتماعی معاشرتی الجھنوں کا حل تلاش کرنے کا میدان فتویٰ کے میدان سے مختلف ہے، اس لیے ایسے معاملات میں فتویٰ کے اصول اور ترجیحات کو بنیاد بنانے کی



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


بجائے تحقیق اور استدلال کا قدرے وسیع دائرہ متعین کرنا ہوگا اور اس کے لیے اہل سنت والجماعت کے علمی اصول اور مسلمات کو دائرہ قرار دینا زیادہ مناسب ہوگا۔.....ملکی قوانین کی تدوین میں رائے دینا، اجتماعی ملی مسائل ومشکلات پر بحث کر کے ان کے حل کا راستہ نکالنا اور بین الاقوامی قانون وثقافت کے ساتھ اسلامی احکام وقوانین کے ٹکراؤ کا جائزہ لے کر قابل عمل راستہ تلاش کرنا میرا ذوق ہے اور ''الشریعہ'' کا ہدف اور دائرہ کار بھی یہی ہے۔اس لیے ہماری یہ ہمیشہ درخواست ہوتی ہے کہ ہمارے کام کو فتویٰ کے دائرہ کار کے حوالے سے نہیں بلکہ ملی مسائل میں بحث ومباحثہ کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔مفتی صاحب کوئی فتویٰ دیتے ہیں تو وہ فیصلہ دے رہے ہوتے ہیں، لیکن جب ہم کسی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں تو اس کی حیثیت فیصلہ کی نہیں ہوتی، رائے کی ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی مقدمہ پر بحث کے دوران وکیل ہر طرح کی بات کرتے ہیں، مسئلے کے ہر پہلو کو واضح کرتے ہیں، بال کی کھال اتارتے ہیں اور تجزیہ وتنقیح کا کوئی پہلو نظر انداز نہیں کرتے، مگر ان کی کوئی بات فیصلہ کا درجہ نہیں رکھتی۔ فیصلہ جج نے کرنا ہوتا ہے اور ہمارے بحث ومباحثہ میں جج کا درجہ امت کے اجتماعی علمی دائرے کو حاصل ہے۔ جو بات اجتماعی قبول کے دائرے میں آ جائے گی، وہ فیصلہ ہوگی اور جس کی وہاں تک رسائی نہیں ہوگی، وہ وکیل کی انفرادی نکتہ رسی قرار پا کر فائلوں میں دبی رہ جائے گی۔

اب میں اس مسئلے کے دوسرے پہلو کی طرف آتا ہوں کہ ایسے مسائل پر عمومی بحث ومباحثہ نہ ہونے کے نقصانات کیا ہوتے ہیں اور ہم اس آزادانہ بحث ومباحثہ کو ضروری کیوں سمجھتے ہیں۔اس کے مختلف پہلوؤں میں سے سر دست ایک پر نظر ڈال لیں کہ کچھ عرصہ سے ہمارے ہاں یہ روایت سی بن گئی ہے کہ ہم کسی اجتماعی مسئلے پر دینی اور شرعی حوالے سے ایک قدم اٹھا لیتے ہیں، فیصلہ کر لیتے ہیں، لیکن اس پر آزادانہ علمی بحث نہ ہونے کی وجہ سے اس فیصلے کی علمی توجیہ سامنے نہیں آتی اور دلائل کا پہلو اوجھل رہتا ہے جس سے کنفیوژن پیدا ہوتی ہے اور فیصلہ ہو جانے اور اس پر عمل درآمد ہو جانے کے باوجود علمی دنیا میں وہ فیصلہ بدستور معلق رہتا ہے۔مثال کے طور پر ہم نے غلامی کا شعبہ بالکل ترک کر رکھا ہے، حالانکہ غلاموں اور لونڈیوں کے احکام قرآن کریم میں اور احادیث نبویہ میں اور فقہ اسلامی میں صراحت کے ساتھ موجود ہیں، لیکن ان میں سے کسی پر آج عمل نہیں ہو رہا، بلکہ گزشتہ دو صدیوں کے دوران ہم نے دنیا کے کسی بھی حصہ میں ''جہاد'' کے عنوان سے جو جنگ بھی لڑی ہے، اس میں کسی کو نہ غلام بنایا ہے نہ لونڈی بنایا ہے جس کی وجہ سے ان سے متعلق فقہی احکام وقوانین عملاً متروک ہو کر رہ گئے ہیں۔سوال یہ ہے کہ اس تبدیلی کی علمی بنیاد کیا ہے اور اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟ آپ گزشتہ نصف صدی کے دوران پاکستان کے دینی مدارس سے فارغ ہونے والے علمائے کرام سے استفسار کر لیں۔ان میں سے شاید ایک فیصد بھی ایسے حضرات نہ نکلیں جو اس کی کوئی علمی توجیہ کر سکیں یا یہ بتا سکیں کہ قرآن وحدیث اور فقہ میں غلامی کے بارے میں واضح احکام موجود ہونے کے باوجود ان پر عمل کیوں نہیں ہو رہا؟ ہم سمجھتے ہیں کہ کم از کم دینی مدارس کے اساتذہ اور طلبہ اور دین کی دعوت وتعلیم سے تعلق رکھنے والے حضرات کو یہ بات ضروری طور پر معلوم ہونی چاہیے کہ ایسا کیوں ہوا ہے، ان احکام پر عمل نہ کرنے کا شرعی جواز کیا ہے، اور کیا یہ عارضی صورت حال ہے یا مستقل طور پر اس کو جاری رکھنا ضروری ہے۔


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



اسی طرح قادیانیوں کے بارے میں ہم نے اجتماعی طور پر فقہی احکام کو نظر انداز کرتے ہوئے فیصلہ کیا ہے کہ انہیں غیر مسلم اقلیت کے طور پر ملک میں رہنے کا حق دیا جائے گا اور ان کے جان و مال کے تحفظ کی حکومت ذمہ دار ہوگی۔ یہ فیصلہ جو تمام مکاتب فکر کے علمائے کرام نے متفقہ طور پر کیا ہے اور ملک میں نافذ العمل ہے، ہمارے روایتی فقہی موقف سے ہٹ کر ہے۔ میں اس فیصلے کی مخالفت نہیں کر رہا، بلکہ اس کے حق میں ہوں اور اس کو قانونی اور دستوری درجہ دلوانے کے لیے عملی جدوجہد کرنے والوں میں شامل ہوں، لیکن سوال یہ ہے کہ اس کی علمی توجیہ کیا ہے اور ایسا کرنا شرعی طور پر کیا حیثیت رکھتا ہے؟ ہمارے خیال میں اس پر علمی مباحثہ ضروری ہے اور نہ صرف علما وطلبہ بلکہ جدید تعلیم یافتہ طبقات کے سامنے بھی اس امر کی وضاحت ضروری ہے کہ یہ تبدیلی کیوں آئی ہے اور اس کا شرعی جواز کیا ہے؟

اس کے ساتھ ہی اس پر بھی غور فرمالیں کہ پاکستان بننے کے بعد ایک اسلامی ریاست کی تشکیل کے لیے ہم نے روایتی فقہی موقف سے ہٹ کر ووٹ کی بنیاد پر حکومت کی تشکیل کو بنیاد بنایا ہے اور اب تک ہمارا اجتماعی موقف یہی ہے کہ حکومت ووٹ کی بنیاد پر بنے گی، البتہ وہ قرآن وسنت کے احکام کی پابند ہوگی۔ یہ فیصلہ کرنے والوں میں ہمارے اکابر شامل تھے اور تمام مکاتب فکر کے اکابر بزرگوں نے یہ فیصلہ کیا تھا، مگر اس کی علمی توجیہ ہمارے علمائے کرام اور دینی کارکنوں کے سامنے نہیں ہے جس کی وجہ سے ابھی تک کنفیوژن موجود ہے اور جمہوریت کو مطلقاً کفر قرار دینے والوں میں نہ صرف سوات کے مولانا صوفی محمد پیش پیش ہیں بلکہ دینی کارکنوں کی اکثریت بھی یہی ذہن رکھتی ہے، اور یہ سوال لوگوں کے ذہنوں میں مسلسل پریشانی کا باعث بن رہا ہے کہ اگر جمہوریت مطلقاً کفر ہے تو شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ، علامہ سید سلیمان ندویؒ، حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، حضرت مولانا سید یوسف بنوریؒ، حضرت مولانا شمس الحق افغانیؒ اور حضرت مولانا مفتی محمد حسنؒ سمیت ان اکابر کی کیا حیثیت ہے جنہوں نے ایک اسلامی ریاست کے قیام کے لیے ووٹ کو بنیاد قرار دیا تھا اور ۱۹۷۳ء کا دستور تشکیل دینے والے تمام مکاتب فکر کے ان سرکردہ علمائے کرام کی کیا پوزیشن ہے جنہوں نے ووٹ کی بنیاد پر حکومت کے قیام کو تسلیم کیا ہے؟

ہمیں اپنے بزرگ مفتیان کرام کے ارشادات سے اتفاق ہے کہ عام مسلمان کو دین کے دائرہ کا پابند رکھنے اور بے راہ روی سے بچانے کے لیے تحفظات کا برقرار رکھنا ضروری ہے اور ہم افتا کے دائرے میں ان کے اس موقف اور اسلوب کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن حاجات عامہ، دستور و قانون کی تدوین اور اجتماعی معاشرتی مسائل کے حل کے لیے جس توسع کی ضرورت ہے اور اس کی شرعاً گنجایش بھی ہے، اس کے بارے میں انہیں اس قدر سختی روا نہیں رکھنی چاہیے بلکہ بحث ومباحثہ کی حد تک کھلے ماحول کو برداشت کرنا چاہیے اور اس کو فتویٰ کی ترجیحات پر پرکھنے کی بجائے اجتماعی ملی ضروریات کے دائرے میں سمجھنا چاہیے۔......

میرا نقد واعتراض کا انداز مناظرین ومجادلین کے طرز استدلال سے مختلف ہے۔ میری کوشش ہمیشہ یہ رہی ہے اور آئندہ بھی رہے گی کہ طعن وتشنیع اور تحکم کی بجائے افہام وتفہیم سے کام لیا جائے اور جس سے اختلاف کیا جا رہا ہے، اسے مسترد کرنے کی بجائے واپس لانے کی کوشش کی جائے۔ میں ہر حال میں آپریشن کر دینے کا قائل نہیں ہوں بلکہ



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com



واپسی کے لیے محفوظ راستہ دینے کو ترجیح دیتا ہوں اور اس کے لیے کوشش بھی کرتا ہوں۔ یہ صرف غامدی صاحب کے حوالے سے نہیں ہے بلکہ جو دانشور بھی کسی وجہ سے جمہور کے جادۂ اعتدال سے ہٹ کر بات کر رہے ہیں، ان سب کے بارے میں میری خواہش اور کوشش یہی ہے۔ ایک تاریخی واقعہ اس حوالے سے میرے ذہن میں اٹکا ہوا ہے اور شاید یہی میرے اس اسلوب اور طرزِ عمل کا باعث بھی یہی ہے کہ معتزلہ کا بانی واصل بن عطا حضرت حسن بصریؒ کے حلقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ معقولات کی دنیا کا آدمی تھا اور عقلی نوعیت کے سوالات کرتا رہتا تھا۔ حضرت حسن بصری اپنی تمام تر علمی عظمت اور تقویٰ اور بزرگی کے باوجود اس دنیا کے آدمی نہیں تھے، اس لیے اس نے جب حضرت حسن بصریؒ کے حلقہ سے علیحدگی اختیار کی تو انہوں نے اطمینان کا اظہار فرمایا کہ ' اعتزل عنا '، وہ ہم سے الگ ہو گیا ہے اور حضرت حسن بصریؒ کے اسی تاریخ جملہ سے واصل بن عطا اور اس کے پیروکاروں کا نام ''معتزلہ'' پڑ گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر واصل بن عطا کا واسطہ حضرت امام ابوحنیفہؒ کی مجلس سے ہوتا تو اسباب کی دنیا میں شاید نتیجہ یہ نہ نکلتا، اس لیے کہ امام ابوحنیفہؒ کی مجلس میں سوال وجواب ہوتے تھے، بحث ومباحثہ ہوتا تھا، اختلاف رائے ہوتا تھا، دلائل دیے جاتے تھے اور منطق واستدلال کے ساتھ ایک دوسرے کو قائل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی، حتیٰ کہ اگر کسی شریک محفل کو مجلس کے اجتماعی فیصلہ پر اطمینان نہ ہوتا تو اسے اختلافی نوٹ لکھوانے کا حق بھی ہوتا تھا۔ آج یہ اسلوب ہمارے ہاں مفقود ہو گیا ہے اور خود ہم احناف اس اسلوب سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔......

قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح اور ان سے استدلال واستنباط کے حوالے سے مجھے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں ہے کہ اس کا دروازہ بالکل بند ہو چکا ہے اور اب علما ومحققین کا کام صرف ماضی کی تعبیرات وتشریحات اور استنباطات واجتہادات میں سے ضرورت کے مطابق انتخاب کرنا اور ترجیحات قائم کرنا ہے۔ قرآن وسنت سے استدلال واستنباط ماضی کی طرح حال اور مستقبل کے اہل علم کا بھی حق ہے اور یہ سلسلہ قیامت تک چلتا رہے گا، لیکن اس کے ساتھ مجھے اس بات سے بھی شدید اختلاف ہے کہ نئے استدلال واستنباط اور تعبیر وتشریح کے لیے ماضی کی تعبیرات سے لاتعلقی بلکہ کسی موقع پر ان سے براءت اور ان کی نفی بھی ضروری ہے۔ علمی ارتقا اس کا نام نہیں ہے کہ چودہ سو سال کے علمی تسلسل کو نظر انداز کر کے اور اسے ''محض روایت'' قرار دے کر قرآن وسنت سے براہ راست استدلال واستنباط کے زیرو پوائنٹ کی طرف الٹی زقند لگا دی جائے، بلکہ کسی بھی علم میں ارتقا ماضی کے تسلسل کو تسلیم کرتے ہوئے اس سے آگے بڑھنے کا نام ہے۔ اس لیے زمانے کی بدلتی ہوئی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نئے استدلال واستنباط کا حق تسلیم کرنے کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ ایسا کوئی بھی استدلال واستنباط قابل قبول نہیں ہو سکتا جس سے ماضی کے اجتہادات اور جمہور اہل علم کے رجحانات کی کلیتاً نفی ہوتی ہو۔

میں اس سلسلے میں امت کے اساطین علم میں سے دو بزرگوں کا حوالہ دینا چاہوں گا۔ ایک امام اعظم حضرت امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ ہیں جنھوں نے واضح طور پر فرما دیا کہ جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہر ارشاد سر آنکھوں پر، صحابہ کرام کے فیصلے بھی ہمارے لیے واجب العمل ہیں اور اگر کسی مسئلے میں صحابہ کرام کے درمیان اختلاف ہے تو ہم ان



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


کے اقوال میں سے کسی ایک کا انتخاب کریں گے اور ان کے اقوال کے دائرے سے باہر نہیں نکلیں گے، البتہ ان کے بعد ہمارے زمانے میں بات آئے گی تو 'نحن رجال وھم رجال'، پھر ہم کسی کے پابند نہیں ہیں۔ جس طرح دوسرے حضرات اجتہاد کرتے ہیں، ہم بھی اجتہاد کریں گے۔

''صحابہ کرام کے اقوال کے دائرے میں رہنا اور اس سے باہر نہ نکلنا'' ایک ایسا اصول ہے جو نہ صرف حضرت امام ابوحنیفہؒ کے اجتہادات کی ایک اہم اساس ہے، بلکہ ''اہل السنۃ والجماعۃ'' میں ''الجماعۃ'' کا لفظ بھی اسی کی غمازی کرتا ہے، اس لیے میں یہ سمجھتا ہوں کہ ہر زمانہ میں نئی تعبیر وتشریح اور استدلال واستنباط کی گنجایش ہے اور ایسا ہمیشہ سے ہوتا آ رہا ہے، لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اس سے ماضی کے اجتہادات اور علمی تسلسل بالخصوص حضرات صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اجماعی فیصلوں اور رجحانات کی نفی نہ ہو، بلکہ نیا استدلال واستنباط ماضی کے علمی تسلسل میں اضافہ اور اس کے ارتقا کا باعث بنے۔

دوسرے بزرگ حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ ہیں جنھوں نے حجۃ اللہ البالغہ کے مقدمہ میں بعض حوالوں سے قرآن وسنت کی نئی تعبیر وتشریح اور استدلال واستنباط کی ضرورت بیان کی ہے اور اس اعتراض کو پوری قوت کے ساتھ رد کر دیا ہے کہ کسی نئی علمی بحث کی ضرورت نہیں ہے، اور چونکہ اسلاف نے یہ باتیں نہیں کہیں ('لان السلف لم یدونوہ') اس لیے اب کسی کو اس کا حق حاصل نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس فکر کو مسترد کرتے ہوئے نئے دور کے تقاضوں کے مطابق نئے استدلال واستنباط کی اہمیت وضرورت کو واضح کیا ہے اور پوری حجۃ اللہ البالغہ میں انھوں نے اول سے آخر تک یہی کام کیا ہے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے یہ اعلان بھی ضروری سمجھا ہے اور میرے نزدیک ایسے علمی مباحث میں حضرت امام ولی اللہ دہلویؒ کا یہ ارشاد ہی قول فیصل کی حیثیت رکھتا ہے کہ:

> وھا انا برئ من کل مقالة صدرت مخالفة لآیة من کتاب اللہ او سنة قائمة عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم او اجماع القرون المشھور لھا بالخیر او ما اختارہ جمھور المجتھدین ومعظم سواد المسلمین فان وقع شئ من ذلک فانہ خطا رحم اللہ تعالیٰ من ایقظنا من سنتنا او نبھنا من غفلتنا اما ھولاء الباحثون بالتخریج والاستنباط من کلام الاوائل المنتحلون مذھب المناظرة والمجادلة فلا یجب علینا ان نوافقھم فی کل ما یتفوھون بہ ونحن رجال وھم رجال والامر بیننا وبینھم سجال

> ''اور ہاں، میں ہر اس بات سے بری ہوں جو مجھ سے قرآن کریم کی کسی آیت یا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی کسی سنت قائمہ کے خلاف صادر ہوگئی ہو یا خیر القرون کے اجماع، جمہور مجتہدین کے فیصلوں اور امت مسلمہ کے اجماعی رجحان کے منافی ہو۔ اگر ایسی کوئی بات ہوگئی ہے تو یہ خطا ہے۔ جو صاحب ہمیں اس اونگھ سے بیدار کریں گے اور غفلت پر خبردار کریں گے، اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمت ہو۔ البتہ یہ لوگ جو پہلے بزرگوں کے کلام سے استنباط وتخریج میں بحث کرتے ہیں اور مناظرہ ومجادلہ کے ذوق واسلوب کی طرف منسوب ہیں، ہمارے لیے یہ ضروری


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


نہیں ہے کہ ہم ان کی ہر اس بات میں ان کی موافقت کریں جو ان کے منہ سے نکل جائے، کیونکہ وہ بھی مرد ہیں اور ہم بھی مرد ہیں اور یہ معاملہ ہمارے اور ان کے درمیان کنویں کے ڈول کی طرح گھومتا ہے۔''

اس لیے میں یہ گزارش ضروری سمجھتا ہوں کہ افراط وتفریط دونوں سے بچنے اور اعتدال وتوازن سے کام لینے کی ضرورت ہے، کیونکہ نہ ضروریات سے انکار کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی تحفظات کو نظر انداز کر دینا دانش مندی ہے۔ صحیح بات وہی ہوگی جو ان دونوں کو سامنے رکھ کر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صحیح رخ پر چلنے اور اس پر استقامت کی توفیق سے نوازیں۔ آمین یا رب العالمین۔......

[الشریعہ، مئی رجون ۲۰۰۹ء]

## اختلاف رائے کے دائرے، حدود اور آداب

ہمارا عمومی مزاج یہ بن گیا ہے کہ کسی اختلاف کی اصل سطح اور دائرہ کو پیش نظر رکھے بغیر ہر اختلاف میں ایک ہی طرح کا طرز عمل اختیار کر لیا جاتا ہے جس سے اختلافات اکثر اوقات تنازعات کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ اس لیے میں مذہبی اختلافات کی مختلف سطحوں اور دائروں کے بارے میں اپنے طالب علمانہ مطالعہ کی روشنی میں کچھ امور کا ذکر کرنا مناسب سمجھتا ہوں:

☆ مذہبی اختلافات کا ایک دائرہ ایمان اور کفر کا ہے اور ادیان و مذاہب کی سطح کا ہے جیسا کہ مسلمان، مسیحی، یہودی، سکھ، ہندو اور بدھ مت وغیرہ مذاہب کے درمیان ہے۔

☆ ایک دائرہ حق و باطل کا ہے جسے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ اہل قبلہ کے مختلف گروہوں کا باہمی اختلاف کہتے ہیں۔ یہ اہل سنت، معتزلہ، خوارج، روافض اور منکرین حدیث کے درمیان اختلافات کا دائرہ ہے جو اپنی تمام تر شدت اور سنگینی کے باوجود بہرحال پہلے دائرہ سے مختلف ہے اور میں اسے حق و باطل کے اختلافات سے تعبیر کیا کرتا ہوں۔

☆ تیسرا دائرہ اہل سنت کے اپنے داخلی ماحول میں فقہاء کرامؒ کے اختلافات کا ہے جس کا تعلق احکام و مسائل سے ہے مثلاً احناف، شوافع، مالکیہ، حنابلہ اور ظواہر کے باہمی فقہی اختلافات ہزاروں مسائل میں ہیں لیکن یہ اختلافات ایمان و کفر اور حق و باطل کی سطح کے نہیں ہیں بلکہ خطا و صواب کے دائرے کے ہیں۔ کیونکہ فقہ واجتہاد کے باب میں اہل السنۃ کا مسلّمہ اصول یہ ہے کہ کسی مسئلہ میں جو موقف ہم میں سے کسی نے اختیار کیا ہے وہ صواب ہے جبکہ دوسری طرف کا موقف خطاء پر مبنی ہے (ولکن یحتمل الصواب) مگر اس میں صواب کا احتمال بھی موجود ہے۔

☆ چوتھا دائرہ اولیٰ وغیر اولیٰ کا ہے جو ایک ہی فقہ کے پیروکاروں کے درمیان اکثر موجود رہا ہے اور یہ اتنا معمولی ہوتا ہے کہ اسے خطا و صواب سے تعبیر کرنے کی گنجائش بھی بسا اوقات نہیں ہوتی۔

☆ پانچواں دائرہ حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی تشریحات کے مطابق عقائد کی تعبیرات کا ہے، حضرت شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ مسلّمہ عقائد کے باب میں کسی عقیدہ سے اختلاف کی وجہ سے تو اختلاف کرنے والوں کو اہل السنۃ کے دائرہ


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


سے خارج قرار دیا جا سکتا ہے لیکن نفس عقیدہ کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی تعبیر میں اختلاف کرنے والوں کو اہل السنۃ سے خارج قرار دینے کو وہ درست نہیں سمجھتے۔ مختلف عقائد کی تعبیرات کے بارے میں اشاعرہ، ماتریدیہ اور ظواہر کے بیسیوں باہمی اختلافات اسی زمرہ سے تعلق رکھتے ہیں اور اس کے باوجود یہ تینوں گروہ اہل السنۃ والجماعۃ کا حصہ شمار ہوتے ہیں۔

ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم نے اختلافات کے مختلف دائروں اور سطحوں کو باہم گڈ مڈ کر رکھا ہے۔ بات اولیٰ اور غیر اولیٰ کی ہوتی ہے جبکہ ہم کفر و اسلام کے ہتھیاروں کے ساتھ جنگ لڑ رہے ہوتے ہیں، بات خطا و صواب کی ہوتی ہے مگر ہم حق و باطل کے پرچم اٹھائے ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار دکھائی دینے لگتے ہیں۔ اگر ہم اختلافات کے دائروں اور سطحوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہر اختلاف کو اس کے اصل دائرہ میں رکھیں تو بہت سے تنازعات خود بخود حل ہو جائیں اور باہمی احترام اور رواداری کا ماحول بھی فروغ پانے لگے۔

---

ہمارے ایک فاضل دوست نے ایک فکری نشست میں اختلافات اور بحث و مباحثہ کے موضوع پر اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ ہمارے ہاں تحقیق کا مطلب حق کی تلاش نہیں ہوتا بلکہ حق کو ثابت کرنا ہوتا ہے کہ جو حق ہمارے پاس موجود ہے اس کو ثابت کرنے کے لیے دلائل دیں اور اس کے خلاف پائے جانے والے شکوک و شبہات کے ازالہ کی علمی محنت کریں۔

مجھے نصوص صریحہ کی حد تک اس بات سے مکمل اتفاق ہے کہ جو بات قرآن کریم اور حدیث و سنت سے اللہ تعالیٰ اور جناب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کی صورت میں یقینی طور پر ثابت ہو جائے، وہ بہر حال حق ہے اور اسے دلائل کے ساتھ ثابت کرنا ہی ہماری دینی و علمی ذمہ داری ہے، لیکن کیا غیر منصوص اور غیر صریح احکام و مسائل کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے؟ مجھے اس میں کلام ہے، اس لیے کہ غیر منصوص اور غیر صریح احکام و مسائل میں حکم، مصداق اور تعبیر کا تعین رائے اور اجتہاد سے ہوتا ہے۔ رائے اور اجتہاد کا دائرہ یہ ہے کہ پیغمبر علیہ السلام کے سوا کسی بھی شخصیت کی رائے اور تعبیر سے اختلاف کیا جا سکتا ہے اور کیا جاتا رہا ہے۔ سینکڑوں فقہاء کرامؒ نے اس دائرہ میں ایک دوسرے سے اختلاف کیا ہے اور بڑے بڑے اکابر فقہاء کرامؒ نے بہت سے مسائل میں ایک رائے قائم کرنے کے بعد اس سے رجوع کیا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ اس لیے یہ کہنا کہ کسی غیر منصوص اور اجتہادی مسئلہ میں ہمارے ذہن میں جو رائے قائم ہو گئی ہے، حق اسی میں بند ہو گیا ہے، حق کی تلاش کی مزید تحقیق کی گنجائش باقی نہیں رہی اور ہم نے اس کے بعد جو تحقیق کرنی ہے، اسی کو ثابت کرنے کے لیے کرنی ہے، درست بات نہیں ہے۔

[الشریعہ، اگست ۲۰۱۳ء]

آج کے حالات میں آزادانہ بحث و مباحثہ کے بغیر کسی بھی مسئلے میں منطقی نتیجے تک پہنچنا ممکن نہیں ہے اور عالمی ذرائع ابلاغ اور تعلیمی مراکز نے اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مختلف اطراف سے شکوک و شبہات پیدا کرنے کی جو مہم شروع کر رکھی ہے، اس کے اثرات سے نئی نسل کو محفوظ رکھنے کے لیے ہمارا روایتی اسلوب کافی نہیں ہے۔ ماضی نے اپنا


© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


علمی خزانہ کتابوں اور سی ڈیز کی شکل میں اگل دیا ہے اور آج کوئی بھی ذی استعداد اور باصلاحیت نوجوان اپنے چودہ سوسالہ علمی ماضی کے کسی بھی حصہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنا چاہے یا کسی بھی طبقے کا موقف اور دلائل معلوم کرنا چاہے تو اسے اس کے بھرپور مواقع اور وسائل ہر وقت میسر ہیں۔ اس ماحول میں یہ کوشش کرنا کہ نوجوان اہل علم صرف ہمارے مہیا کردہ علم اور معلومات پر قناعت کریں اور علم اور معلومات کے دیگر ذرائع سے آنکھیں اور کان بند کر لیں، نہ صرف یہ کہ ممکن نہیں بلکہ فطرت کے بھی منافی ہے۔ اس لیے آج کے دور میں ہماری ذمہ داری پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے اور یہ بات ہمارے فرائض میں شامل ہو جاتی ہے کہ مطالعہ اور تحقیق کے اس سمندر سے نئی نسل کو روکنے کی بجائے خود بھی اس میں گھسیں اور ان متنوع اور مختلف الجہات ذرائع معلومات میں حق کی تلاش یا حق کے دائرے کو محفوظ رکھنے کے لیے ان کی راہ نمائی کریں۔ چنانچہ علم وفکر کی دنیا میں میرا ذوق روکنے یا باز رکھنے کا نہیں بلکہ سمجھانے اور صحیح نتیجے تک پہنچنے کے لیے ہر ممکن مدد کرنے کا ہے۔ کسی دوست کو یہ طریقہ پسند ہو یا نہ ہو، لیکن میں اسی کو صحیح سمجھتا ہوں۔ اس کے لیے بحث ومباحثہ ضروری ہے، مسائل کا تجزیہ وتنقیح اور دلائل کی روشنی میں ان کا خالص علمی انداز میں تلاش کرنا ضروری ہے۔ ایک عرصہ تک میرا بھی یہ ذوق اور ذہن رہا ہے کہ تحقیق کا دائرہ صرف یہ ہوتا ہے کہ جو بات ہم اپنے ذہن میں پہلے سے طے کر چکے ہیں، اسے کسی نہ کسی طرح ثابت کر دیا جائے۔ مگر رفتہ رفتہ یہ بات ذہن میں راسخ ہوتی گئی کہ خود اپنی بات کو دلائل اور حقائق کے معیار پر پرکھنا بھی تحقیق کا اہم ہدف ہوتا ہے۔ بہت سے مسائل میں اکابر اہل علم کا رجوع الی الحق بالخصوص حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی طرف سے اس کا باقاعدہ اہتمام میرے ذوق میں اس تبدیلی کا باعث بنا۔

[الشریعہ، دسمبر ۲۰۱۱ء]

## رائے کی اہلیت اور بحث ومباحثہ کی آزادی

ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم صرف تحفظات کے دائرے میں محصور رہنے کو درست نہیں سمجھتے، بلکہ ان ضروریات پر بھی ہماری نظر ہے جو آج کے معروضی حالات میں اہل علم سے سنجیدہ توجہ کا تقاضا کر رہی ہیں۔ تحفظات اور ضروریات کے دائرے ہر دور میں الگ الگ رہے ہیں اور دونوں کے تقاضوں کو سامنے رکھنے والوں کا ذوق اور طرز عمل بھی ہمیشہ ایک دوسرے سے مختلف رہا ہے۔ اگر ماضی کی علمی ودینی تاریخ کو اس پہلو سے دیکھا جائے تو کوئی دور بھی اس کشمکش سے خالی نظر نہیں آتا۔

مثال کے طور پر کوئی واقعہ پیش آئے بغیر محض مسئلہ کی کوئی صورت فرض کر کے اس پر حکم لگانا، جسے ''فقہ فرضی'' کہا جاتا ہے، صحابہ کرام اور تابعین کبار کے دور میں پسندیدہ بات نہیں سمجھی جاتی تھی، حتیٰ کہ ایک بار حضرت امام ابوحنیفہؒ نے حضرت قتادہ سے کوئی مسئلہ پوچھا تو انھوں نے دریافت کیا کہ کیا ایسی کوئی صورت پیش آئی ہے؟ جواب میں امام ابوحنیفہ نے کہا کہ ایسی صورت پیش تو نہیں آئی تو حضرت قتادہ نے فرمایا کہ:

''مجھ سے ایسی باتیں نہ پوچھا کرو جو ابھی واقع ہی نہیں ہوئیں۔''



© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com


(بحوالہ امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی ص ۲۳۵، از مولانا مناظر احسن گیلانی)

جبکہ حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے اس ''فقہ فرضی'' کے لیے باقاعدہ علمی مجلس قائم کر کے محض مفروضہ صورتوں پر ۸۰ ہزار سے زائد احکام ومسائل مرتب کیے جو آج تک فقہ حنفی کی علمی اساس ہیں۔

اسی طرح صحابہ کرام اور کبار تابعین کے دور میں عقائد کے باب میں عقلی بحثوں کو ناپسند کیا جاتا تھا اور اسے عقائد خراب کرنے اور عقائد میں شکوک پیدا کرنے کی کوشش تصور کیا جاتا تھا، حتیٰ کہ میں نے کسی جگہ حضرت امام ابویوسف کا یہ فتویٰ پڑھا ہے، جس کا حوالہ اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے کہ عقائد میں عقلی بحثیں کرنے والے متکلم کے پیچھے نماز جائز نہیں ہے، لیکن بعد میں وقت کی ضروریات نے یہ ماحول پیدا کر دیا کہ عقائد کی بحثیں ہی معقولات کے حوالے سے ہونے لگیں، اس کو باقاعدہ علم کلام کا نام دیا گیا اور اسی عنوان سے یہ ہمارے ہاں مستقل پڑھایا جاتا ہے۔

ہم ''تحفظات'' اور ''ضروریات'' کے دونوں دائروں کو ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمارا نقطہ نظر یہ ہے کہ دونوں کا متوازن اظہار ہوتے رہنے سے ہی اعتدال کا راستہ ملے گا، اسی لیے ہم علمی مباحثہ کو ضروری خیال کرتے ہیں اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ذہن میں علمی مباحثہ کا تصور وہی ہے جس کے تحت حضرت امام اعظم ابوحنیفہؒ نے انفرادی اجتہاد کی بجائے اجتماعی اور مشاورتی اجتہاد کا راستہ اختیار کیا تھا اور اس کے لیے کھلے علمی مباحثہ کو ضروری خیال کیا تھا۔ اس کا خاکہ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ:

''اجتماعی مساعی اسی وقت بار آور ہوتی ہیں جب ضبط ونظم کے تحت ان کو انجام دیا جائے۔ امامؒ پر جہاں یہ راز واضح ہو چکا تھا، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مجلس کے تمام اراکین کو جب تک کامل آزادی اپنے خیالات کے اظہار میں نہیں دی جائے گی، اجتماع کا جو مقصد ہے وہ پورا نہیں ہو سکتا۔ آزادی کے اس دائرے کو امامؒ نے کتنی وسعت دے رکھی تھی؟ اس کا اندازہ اسی واقعے سے ہو سکتا ہے جس کو امامؒ کے مختلف سوانح نگاروں نے نقل کیا ہے۔ الجرجانی کہتے ہیں کہ میں امام کی مجلس میں حاضر تھا کہ ایک نوجوان جو اسی حلقہ میں بیٹھا ہوا تھا، امام سے اس نے کوئی سوال کیا جس کا امامؒ نے جواب دیا، لیکن جوان کو میں نے دیکھا کہ جواب سننے کے ساتھ ہی بے تحاشہ اور امام کو مخاطب کر کے 'اخطات' (آپ نے غلطی کی ہے) کہہ رہا ہے۔ جرجانی کہتے ہیں کہ جوان کے اس طرز گفتگو کو دیکھ کر میں تو حیران ہو گیا اور حلقہ والوں کی طرف خطاب کر کے میں نے کہا کہ

''بڑے تعجب کی بات ہے کہ استاذ (شیخ) کے احترام کا تم لوگ بالکل لحاظ نہیں کرتے۔''

جرجانی ابھی اپنی نصیحت کو پوری بھی نہیں کر پائے تھے کہ وہ سن رہے تھے کہ خود امام ابوحنیفہؒ فرما رہے ہیں کہ

دعهم فانی قد عودتهم ذلك من نفسی

''تم ان لوگوں کو چھوڑ دو، میں نے خود ہی اس طرز کلام کا ان کو عادی بنایا ہے۔''

جس سے معلوم ہوا کہ اس آزادی کا قصداً وارادتاً امام نے اپنی مجلس کے اراکین کو کہیے یا تلامذہ کو، عادی بنا رکھا تھا اور یہ جان کر بنا رکھا تھا کہ جو مقصد ہے، اس آزادی کے بغیر وہ حاصل نہیں ہو سکتا۔'' (امام ابوحنیفہ کی سیاسی


© rasailojaraid.com